مولانا سعید الرحمٰن علوی

مولانا قاری محمد طیب

دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم (چانسلر) مولانا محمد طیب قاسمی ۶ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ (۱۷ جولائی ۱۹۸۳ء) کو دیوبند میں انتقال فرماگئے۔ اس مشہور عالم قصبے کے قبرستان قاسمی میں ہی آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم مدیر تجلی دیوبند اس مدرسے کے متعلق کہا کرتے تھے کہ "یہ ہمارا تاج محل ہے اور یہ ہماری موتی مسجد ہے۔" نیز ان کا کہنا تھا کہ "اگر بزرگانِ دین دارالعلوم دیوبند کی بنیاد نہ ڈالتے تو دین ہندوستان میں بیگانہ اور اجنبی بن کر رہ جاتا۔"[1]

برعظیم میں مسلمانوں کی عظمت کا محل انہی کی بے حسی اور غیروں کی بے دردی کے سبب ۱۸۵۷ء میں زمین بوس ہوا تو اسے از سرِ نو تعمیر کرنے کی غرض سے جو لوگ میدانِ عمل میں آئے جو اب تک بدیسی حکمرانوں سے باقاعدہ عملی میدان میں نبرد آزما تھے۔ ان اساطینِ ملت کا شجرۂ علمی و روحانی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ سے ملتا تھا۔ اب کے ان حضرات نے توپ و تفنگ کے بجائے شہری آبادیوں سے بہت دور اس چھوٹے سے قصبے دیوبند میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی جو دراصل ایک علمی تحریک تھی ــــ ایک دانشور نے اس مدرسہ و تحریکِ علمی کو "برصغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ اور اسلامی تعلیم و ثقافت اور ملت کی نشأۃِ ثانیہ کا سرچشمہ" قرار دیا۔ تو دوسرے نے "۱۸۵۷ء کے بعد ملک و ملت کی نشأۃِ ثانیہ کا نقطۂ آغاز" لکھا۔ اس کے اصل محرک و قائد قاری محمد طیب صاحب کے جد امجد مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔

حضرت قاری صاحب اس عظیم ادارے کے ہی سند یافتہ تھے اور اسی کی خدمت کے لیے ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں بطور نائب مہتمم اور پھر ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں بطور مہتمم ان کا تقرر ہوا۔ مرحوم کی یہ تقرری مجلسِ شوریٰ نے کی جو ہر دور میں اس ادارے کا بااختیار ادارہ رہی اور اب بھی اس کی یہی حیثیت ہے۔ وفات سے سال ڈیڑھ سال قبل وہ اس منصب سے مستعفی ہوئے۔ اس طرح انہوں نے مجموعی طور پر اس ادارے کی ساٹھ برس

---

[1] تعمیر انسانیت، ص ۹۹ ــ ماہ اپریل ۱۹۸۰

کے قریب خدمت کی جو ایک ریکارڈ ہے۔ مرحوم سید محبوب رضوی صاحب تاریخ دارالعلوم میں ان کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" جب آپ نے اہتمام کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، اب ۲۳ ہیں۔ جب سالانہ آمدنی پچاس ہزار کچھ روپے تھی، اب ۲۶ لاکھ ہے[۵۲] (یہ تحریر ۱۹۷۸ کی ہے لیکن اب سالانہ بجٹ ۴۷ لاکھ ہے)۔ اس سے آگے ان عمارات کی تفصیل ہے جو مرحوم کے زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں دارالتفسیر، دارالافتا، دارالقرآن، مطبخ جدید، فوقانی دارالحدیث، مسجد کا بالائی حصہ باب الظاہر (منسوب بہ ظاہر شاہ افغان حکمران)، جامعہ طبیہ جدید، دومنزلہ دارالاقامہ، مہمان خانہ، وسیع اور عظیم الشان کتب خانہ، مزید جدید دارالاقامہ، افریقی منزل، درس گاہیں اور مسجد چھتہ (جس سے مدرسہ شروع ہوا) نیز اس سے ملحقہ درس گاہوں کی تعمیر و مرمت۔"

حقیقت یہ ہے کہ تعمیرات کے اعتبار سے قاری صاحب کا دور انتہائی شاندار دور تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دورِ اہتمام میں تعمیرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ علمی طور پر دارالعلوم دیوبند کا یہ دور بھی بڑا پرشکوہ ہے۔ دنیائے اسلام میں اس علمی تحریک کا تعارف نیز بین الاقوامی محافل علمی میں علما کی مؤثر و بھرپور نمائندگی کا سہرا بھی قاری صاحب کے سر ہے۔

آپ جب نائب مہتمم تھے تو اس وقت مدرسے کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری تھے جن کے درس حدیث کو سن کر علامہ سید رشید رضا مصری نے بھی تحسین کے کلمات کہے تھے۔ قاری صاحب خود بھی حضرت شاہ صاحب کے شاگرد تھے، مدرسۂ دیوبند کے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن بانی تحریک ریشمی رومال نے ۱۹۱۵ء میں جب حجاز مقدس کا سفر کیا تو یہ سال قاری صاحب اور ان کے رفقائے گرامی (جن میں مولانا غلام غوث ہزاروی بھی تھے) کی فراغت کا سال تھا، لیکن شیخ الہند کے سفر کے سبب ان سب حضرات نے شاہ صاحب سے استفادہ کیا، گویا آپ حضرت شاہ صاحب کے سالِ اول کے شاگرد تھے۔ اساتذہ کی موجودگی میں چند سال نائب مہتمم کے طور پر بھی آپ کو کام کرنے کا موقع کیا، پھر جب اہتمام کا وقت آیا تو مولانا سید حسین احمد مدنی کا دورِ صدارت تھا

---

۵۲ تاریخ دارالعلوم۔ ج ۲، ص ۲۳۶

جنھوں نے پینتیس سال مدرسے کی خدمت کی۔ ان کے بعد مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا فخر الحسن مراد آبادی، مولانا شریف حسن، مولانا نصیر احمد خان صاحب، شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے اور اس پورے عرصے میں قاری صاحب مہتمم تھے۔

۱۹۳۴ء میں (نائب مہتمم ہونے کے زمانے میں) آپ نے حجاز مقدس کا ایک سفر ایک محترم و مؤقر وفد کے سربراہ کے طور پر کیا۔ سلطان ابن سعود رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس خاص میں اس نمائندہ وفد کے قائد کے طور پر آپ نے جو تقریر فرمائی وہ برعظیم میں علما کی شاندار خدمات کی بہترین عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ قاری صاحب کی ذہانت اور علمی بصیرت کی غماز تھی جس کا سلطان مرحوم نے زبردست اثر قبول کیا۔

۱۹۳۹ء میں آپ نے افغانستان کا سفر اختیار فرمایا جس کی ایک مستقل داستان ہے۔ افغانستان کے ساتھ اس تحریک علمی سے وابستہ علما کے تعلقات تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ایک قریبی عزیز مولانا منصور انصاری (مصنف انواع الاوّل) اور مولانا عبید اللہ سندھی جیسے حضرات شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریکِ حریت کے نمائندوں کے طور پر وہاں کام کر چکے تھے، مولانا انصاری کا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ خود افغانستان کے متعدد علما دیوبند کے فیض یافتہ تھے، اس لیے جب قاری صاحب وہاں تشریف لے گئے تو ایک شاہی مہمان کے طور پر ان کی پذیرائی ہوئی۔

پھر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان مصر کے زعیم جمال عبد الناصر مرحوم نے ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے نام سے جو مؤتمر قائم کی، اس میں برعظیم کے جن علما نے شرکت کر کے گہرے اثرات چھوڑے، ان میں قاری صاحب کے ساتھ مولانا مدنی کے صاحبزادے مولانا سید اسعد مدنی، مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا مفتی محمود کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں برما، جنوبی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، مڈغاسکر، حبشہ، انگلینڈ، فرانس، مغربی جرمنی اور آخر میں امریکہ میں آپ نے متعدد دعوتی اور تبلیغی سفر اختیار فرمائے، جن کی روداد یں سن کر قرونِ اولیٰ کے مسلمان مبلغین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

رہا پاکستان تو وہ ایک طرح سے آپ کا گھر تھا۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے ابتدا ہی سے بیعت و تربیت کا تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بعد یہ تعلق مولانا اشرف علی تھانوی سے قائم ہوا۔ انھی سے آپ مجاز تھے۔ مجاز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی افکار کی آپ پر گہری چھاپ تھی اور

آپ تحریک پاکستان اور تقسیم ملک کے زبردست مؤید و ترجمان تھے، اسی لیے تقسیم کے بعد آپ ہندوستان سے بوریا بستر سمیٹ کر پاکستان چلے آئے اور یہاں مستقل قیام کا ارادہ فرمالیا، لیکن مولانا حسین احمد مدنی کے اصرار پر اپنے دادا جان کے چمن کی رکھوالی کے لیے واپسی اختیار فرمائی۔ واپسی کے ضمن میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے حائل رکاوٹوں کو دور کرانے میں مولانا مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مؤثر کردار ادا کیا، اور جب قاری صاحب واپس تشریف لے گئے تو تمام اساتذہ و اراکین مدرسہ نیز طالب علم برادری اور شہر کے بے شمار افراد نے سٹیشن پر مولانا مدنی کی قیادت میں آپ کو خوش آمدید کہا۔ استقبالیہ جلسہ مسجد میں ہوا، مولانا مدنی نے استقبالی تقریر میں یہ شعر پڑھ کر سارے مجمع کو تڑپا دیا ؎

اے تماشہ گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشہ می روی

قاری صاحب کے برادرِ اصغر مولانا قاری محمد طاہر مرحوم کا خاندان پاکستان میں ہے اور خود آپ کے ایک داماد یہاں ہیں، نیز سیکڑوں دینی مدارس، ہزاروں علما اور لاکھوں طلبا آپ کا وہ قبیلہ ہے جنھیں آپ کبھی فراموش نہیں فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصے تک یہاں کے متعدد مدارس کے جلسوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے رہے۔ دستار بندی اور تقسیم اسناد آپ کے ہاتھوں ہوتی رہا۔ بھٹو کے دورِ حکومت میں سیرت کانفرنس کے کئی اجلاسوں میں بطور سرکاری مہمان آپ کی آمد ہوئی اور یہاں آپ کی تقاریر و مقالات بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنے گئے۔

ہندوستان کا کوئی کونہ ایسا نہ تھا جہاں آپ دعوت و تبلیغ اور مدرسے کی ضروریات کے لیے تشریف نہ لے گئے ہوں اور اب تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی ہو یا جامعہ ملیہ دہلی یا دوسرے اس نوع کے عصری تعلیم کے ادارے وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ان کی تقاریب میں قاری صاحب کی شمولیت ضروری ہوتی۔

علی گڑھ میں ایک مرتبہ "سائنس اور اسلام" کے موضوع پر اچانک آپ کی تقریر کا اعلان ہوا۔ ان سطور کے راقم نے پاکستان کے ایک معزز عہدہ دار سے آپ سے سٹیج تک پہنچتے پہنچتے بھی اسی قسم کے عنوان کا اشارہ تھا۔ اب جو اعلان ہوا تو پسینے چھوٹ گئے کہ اس درسگاہ کے اساتذہ و طلبہ کی موجودگی میں اس موضوع پر کیا تقریر کرسکوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم کیا کہ ایسی تقریر ہوگئی کہ [illegible] [illegible]

ہے۔ اس قسم کے آپ کے دورے علمی دنیا میں زبردست انقلابات کا باعث بنتے اور ایک زمانہ بوریہ نشین حضرات کی عظمتوں کا معترف ہوتا — مدرسہ دیوبند میں مختلف تعلیمی شعبوں کی از سر نو تنظیم، شعبۂ تصنیف و تالیف کا قیام، کتب خانے کا نظم اور بین الاقوامی وفود کو یہاں کے کام سے متعارف کرانا، نیز مختلف زبانوں پر لٹریچر تیار کرنا جیسے متعدد کام آپ کے عہدِ زریں کی یادگار ہیں۔

آپ کی زندگی کا آخری کارنامہ مارچ ۱۹۸۰ کا وہ عظیم اجتماع ہے جو دیوبند کی سرزمین پر منعقد ہوا۔ مبالغہ سے بچ کر نہایت احتیاط اور دیانت داری سے کہا جائے تو اس میں ۲۰ لاکھ سے زائد انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس اجتماع میں ہندوستانی وزیر اعظم اور وہاں کی اپوزیشن کی مشہور شخصیات بھی شامل تھیں، جن میں حزبِ مخالف کے لیڈر جگ جیون رام بھی شریک تھے۔ ادھر ہندوستان بھر کے علما، صلحا، شعرا و ادبا کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ ہزاروں علما و عوام پاکستان سے گئے تھے۔ علاوہ ازیں سعودی عرب اور مصر سمیت تمام عرب ممالک اور امریکہ، روس، چائنا، انگلینڈ اور کئی یورپین ممالک، افریقی ممالک، ایشیائی ممالک غرض کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کے علما اور دین دار عوام نہ آئے ہوں۔ بعض یورپین، افریقی اور ممالک کے لوگ مستقل طیارے لے کر آئے۔

محرم ۱۳۱۵ھ (جون ۱۸۹۷) آپ کا سالِ پیدائش ہے۔ گویا آپ قمری حساب سے ۸۸ برس اور شمسی حساب سے ۸۶ برس اس دنیا میں موجود رہے۔ تذکرہ نگاروں کے بقول مظفر الدین تاریخی نام ہے جو ان کی خدمات دینی کے اعتبار سے ایک غیبی اشارہ کہنا چاہیے۔ عرفی نام محمد طیب تھا، یہی مشہور ہوا، تاہم قرأت قرآن کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مقام بخشا تھا اس کے پیش نظر قاری صاحب گویا آپ کے نام کا لازمی حصہ بلکہ اصل نام سے زیادہ معروف ہو گیا۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ نے مکتب دیوبند کے شعبۂ حفظِ قرآن میں داخلہ لیا۔ قدیم رسم کے مطابق تقریب مکتب نشینی و بسم اللہ بڑے اہتمام سے ہوئی جس میں اس دور کے دیوبند کے جملہ شیوخ و اساتذہ نے شریک ہو کر اس فرزندِ عزیز کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد بزرگوار مولانا فضل الرحمٰن نے ایک رباعی اس موقع پر ارشاد فرمائی جس سے مکتب نشینی کی تاریخ بھی برآمد ہوتی ہے۔

جشن المکتب طیب کی مبارک تقریب	کہ نئی طرح کا جلسہ تھا نئی طرح کی سیر
رب یسر جو کہا اس نے تو بیر دئے اتبا	فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمم بالخیر

ایک محسن و مربی نے جس محبت سے تم بالخیر کہا اور باقی سب نے آمین کہی، اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ۱ سال
میں کلام مجید حفظ ہو گیا۔ پھر قدیم فارسی نصاب بڑے اہتمام سے ۵ سال میں پورا کیا، اس کے بعد درجۂ عربی میں داخل
ہو کر ۱۳۳۷ھ میں تکمیل فرمائی ــــ مدرسے کی روایات اور خاندانی اثرات نیز ذاتی ذوق کی بنا پر آپ نے تدریس کو اپنی
زندگی کا مشغلہ بنا یا اور اہتمام کے زمانے میں بھی طویل عرصے تک بڑے اہتمام سے تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔
تاہم آخری چند سال جب ضعف بڑھ گیا اور امور مدرسہ وسعت پذیر ہو گئے تو اس سے آپ دست کش ہو گئے۔
لیکن دعوت و تبلیغ اور علمی مجالس و محافل کا سلسلہ دم واپسیں تک جاری رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطالعہ کا
نہایت بلند ذوق عطا فرمایا تھا، دوران سفر بھی یہ شغل جاری رہتا اور پھر جہاں
بیٹھتے، علم و فضل کے موتی بکھیرتے۔ احقر کے والد بزرگ وار مولانا محمد ... نے دارالعلوم تعلیم القرآن
راجہ بازار راولپنڈی کے جلسے کے موقع پر (جس کا سال اب ذہن میں نہیں) قاری صاحب سے حضرت امام
شافعی قدس سرہٗ کی مشہور رباعی۔ علی ثیاب لو یباع انھا الخ اپنے قلم سے لکھ کر عنایت فرمانے کی
درخواست کی تو آپ نے فوراً کاغذ قلم ہاتھ میں لیا، لیکن اسی وقت بتی بند ہو گئی۔ اندھیرے ہی میں آپ نے
رباعی لکھ ڈالی، خط نہایت خوب صورت اور پاکیزہ تھا۔ یہ رباعی والد صاحب کے ذخیرۂ کاغذات میں بطور
برک موجود ہے۔ احقر نے چند بار آپ کی زیارت کی، ملاقات کا شرف حاصل کیا اور خدمت کی سعادت حاصل
کی۔ یاد پڑتا ہے کہ پہلی زیارت و ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی، جب کہ احقر اپنے محسن و بزرگ بھائی مولانا عزیز الرحمٰن
خورشید کے ہمراہ ملتان کی مشہور دینی درس گاہ خیر المدارس کا طالب علم تھا۔ استاذ مکرم مولانا خیر محمد صاحب جالندھری
مہتمم و منتظم تھے۔ قاری صاحب کے ساتھ آپ کے مراسم بہت گہرے تھے۔ قاری صاحب کی ایک صاحب زادی
ان دنوں ڈیرہ غازی خان میں تھیں، ان سے ملاقات کی غرض سے آپ نے سفر فرمایا، شہر میں آنے کی اجازت نہ
تھی، اس لیے مولانا خیر محمد اور جملہ اساتذہ و طلبا اسٹیشن پر گئے۔ ملتان کی گرمی، دوپہر کا وقت، لیکن حضرت
قاری صاحب انتظار گاہ سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔ چادریں بچھا دی گئیں اور سب لوگ بیٹھ گئے۔
ہمارے مہتمم صاحب نے حضرت قاری صاحب سے قرأت قرآن کی درخواست کی تو آپ نے سفر کی تکان
کے سبب اپنے برادر زادے قاری زاہر القاسمی صاحب کو تلاوت کا حکم دیا۔ ان کے بعد ظہر کی نماز آپ کی
اقتدا میں پڑھی گئی۔ مسافر ہونے کے سبب آپ نے دو رکعات پڑھا۔ ہم نے باقی نماز پوری کی۔ یہ مختصر لیکن
روح آفریں ملاقات سب سے پہلے ہوئی۔

دوسری ملاقات وزیارت اور اس کے ساتھ خدمت کی سعادت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھوی کے مدرسہ سراج العلوم سرگودھا میں نصیب ہوئی۔ یہ اغلباً ۶۳ ۱۹ء کا سال تھا۔ حضرت قاری صاحب دو ماہ سے زائد عرصہ پاکستان رہے۔ اکثر شہروں میں تشریف لے گئے اور مواعظ وتقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا مفتی محمد شفیع سے مرحوم کے بہت گہرے مراسم تھے، دونوں مولانا انور شاہ کے شاگرد تھے۔ قیام پاکستان سے قبل مولانا محمد شفیع نے اپنے آبائی قصبہ گنجیال تحصیل قائد آباد ضلع خوشاب میں مدرسہ قائم کیا تو اس کی افتتاحی تقریب میں مولانا مدنی، قاری صاحب، مولانا اعزاز علی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب جیسے اکابر بلائے گئے۔ اسی موقع پر شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ قاری طیب نہیں بولتے، مولانا نانوتوی کی روح بولتی ہے، اور یہ کہ میں ان کی ایک تقریر سن کر اس سے کئی تقریریں بنا لیتا ہوں۔ اب کے سرگودھا میں قاری صاحب انہی کے مہمان تھے۔ بلاک ۲ کی مسجد سے متصل ایک عزیز کے مکان میں رہائش کا انتظام تھا۔ قاری صاحب کے برادر نسبتی بلاک ۱۹ میں مقیم تھے اور ہمدرد دواخانہ کی سرگودھا شاخ سے متعلق تھے۔ اس سفر میں آپ کی اہلیہ ہمراہ تھیں جو اپنے بھائی کے گھر مقیم تھیں۔ چند طلبا کو جنھیں مرحوم کی خدمت کے لیے نامزد کیا گیا، ہم دونوں بھائی بھی ان میں شامل تھے۔ یہ حضرت مفتی صاحب کا ہم پر خاص کرم تھا۔ دس دن حضرت قاری صاحب کی خدمت کا موقع ملا۔ دن بھر اور رات گئے علمی محافل ومجالس ہوتیں، مطالعہ اور علمی مسائل زیر بحث آتے، اکابر واسلاف کے سبق آموز واقعات سنائے جاتے۔ نفاست وصفائی قاری صاحب کا لازمہ تھیں۔ خوراک برائے نام۔ البتہ دیوبند کی مناسبت سے آموں کے رسیا۔ چال میں وقار، نشست میں توازن واعتدال۔ ہنسنے یا کھلانے کا قصہ نہ تھا۔ الغرض علو اخلاق، تواضع، شرم وحیا کا ایک پیکر ہم نے دیکھا۔

ایک شب لوگوں کے اصرار سے جلسۂ عام ہوا۔ سرگودھا کی تاریخ میں چند خاص جلسوں میں سے یہ جلسہ تھا، حاضری تھی کہ کوئی حساب نہ تھا۔ ۲½ گھنٹے کی تقریر میں بانسہ ملانا یا اس قسم کی حرکات کرنا جو موجودہ مبلغین کا شیوہ ہے نام کو نہ تھیں۔ تسلسل اور روانی ایسی کہ ندی بہہ رہی ہے۔ علمائے دیوبند سے شدید اختلاف رکھنے والے عناصر اور ان کے مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی جماعت جلسے میں موجود تھی، سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اس کے علاوہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اور جامعہ اشرفیہ لاہور، نیز انجمن خدام الدین شیرانوالہ لاہور

میں متعدد مرتبہ ان کی زیارت و ملاقات کا موقع ملا۔ آخری ملاقات مارچ ۱۹۸۰ میں دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ اجتماع صد سالہ کی فقید المثال تقریب میں ہم لوگ بھی شریک ہوئے۔ ایک دن قبل وہاں پہنچ گئے۔ قاری صاحب بہت نڈھال ہو چکے تھے، لیکن ہر معاملے کی دیکھ بھال کے لیے ذاتی طور پر سرگرم عمل تھے مولانا حسین احمد مدنی کے مکان کے سامنے مصافحہ ہوا۔ عرب مسلمانوں کی طرف جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دفتر اہتمام میں حاضری ہوئی۔ برادرم خورشید صاحب کے علاوہ مدیر "الرشید" لاہور مولانا عبدالرشید ارشد اور دوسرے احباب ہمراہ تھے۔ دیوبند سے متعلق مولانا ظفر علی خان مرحوم کی مشہور نظم

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند

مشہور خطاط سید نفیس شاہ صاحب سے لکھوا کر اور خوب صورت آرٹ پیپر پر کئی ہزار چھپوا کر ہم بطور ہدیہ ساتھ لے گئے تھے، وہ پیش کی۔ خدام الدین کے بعض پرچے جن میں دارالعلوم سے متعلق مضامین تھے پیش کیے۔ بے حد خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ مختلف حضرات کے سلام پہنچائے، اور آپ نے ان کی خیریت دریافت کی اور بار بار معذرت کی کہ ہم آپ کی صحیح خدمت نہ کر سکے، نہ خاطر خواہ انتظام ہو سکا۔ اس معذرت میں رواتی کسر نفسی نہ تھی، یہ ان کی قلبی آواز تھی، جس نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ اجتماع سے فارغ ہو کر ہم دہلی وغیرہ چلے گئے۔ واپسی پر چند گھنٹوں کے لیے پھر دیوبند آئے۔ مرحوم کے مکان پر حاضری دی۔ احباب کا مجمع تھا اور قاری صاحب میر محفل۔ ہر ایک خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اجتماع کو کامیاب فرمایا۔ قاری صاحب سراپا عجز ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد میں مصروف اور بار بار مہمانوں سے معذرت میں مشغول کہ ہم خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے۔

واپسی ہوئی تو ہمیں آخری کھانا مولانا سید حسین احمد مدنی کے قدیم مکان پر اور انہی کے دستر خوان پر صاحبزادہ گرامی مولانا محمد ارشد کے ساتھ نصیب ہوا ـــ اس کے بعد آں مخدوم کی زیارت نہ ہوئی۔ بلکہ وہاں اختلاف سے متعلق خبریں آنے لگیں جن کے سبب از حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دورِ کشمکش میں مرحوم نے رضا کارانہ استعفٰی کے ذریعے اپنے آپ کو دیوبند کے نظم سے الگ کر لیا اور صحت جو پوری طرح ہل چکی تھی، اس کی بحالی کے لیے بمبئی اور بعد میں اپنے نواسوں کے پاس امریکہ قیام پذیر رہے۔ واپسی پر اطمینان تھا، لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ اطمینان عارضی ہے۔ چنانچہ تکلیف کے اشتداد کے پیشِ نظر دو مرتبہ دہلی ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ بالآخر موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے اپنے اساتذہ، شیوخ اور دوسرے علما و صلحا سے موصوف کے لیے ہمیشہ اونچے کلمات سنے جس سے، ان کی عظمت روز بروز میرے دل میں بڑھتی چلی گئی۔ یہ قصہ میرے سامنے کا ہے کہ مولانا عبید اللہ انور جو ان کے شاگرد ہیں، ان سے ملنے گئے تو قاری صاحب نے بڑے تپاک سے ان کو گلے لگایا اور فرمایا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے تعلق سے آپ تو ہمارے مخدوم ہیں اور خود ہی بتلایا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب اللہ صاحب کے ساتھ پڑھنے کی غرض سے جب آپ کو دیوبند بھیجا گیا تو مولانا سندھی نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر آپ کے داخلے کے لیے لکھا جسے میں نے چوم کر بطور تبرک و نسخۂ نجات اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

میں نے یہ بات بھی براہ راست ان سے سنی کہ کابل کے عظیم الشان دربار میں جب سپاس نامہ پیش ہو چکا تو جوابی تقریر کے سلسلے میں ذرا سا میں تشویش کا شکار رہا کہ روانی سے فارسی کیونکر بول سکوں گا؟ لیکن معاً میری توجہ مولانا مدنی کی طرف گئی اور پھر ایسا انشراح ہوا کہ کہنے کی بات نہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مجاز و خادم مولانا محمد اشرف سلیمانی پشاور یونیورسٹی نے دیوبند اور قاری صاحب کے باہمی تعلق پر خوب لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

" دارالعلوم کے فیض نے حضرت قاری صاحب کے جواہر باطنی کو تابانی بخشی اور ان کی خداداد استعداد کو نکھارا اور انھیں وہ بنایا جس سے پورے عالم میں ان کے کمالات کا اظہار ہوا۔ قاری صاحب نے دارالعلوم کی بقا، شہرت، نیک نامی اور ترقی و وسعت کے لیے زندگی صرف کر دی "۔ موصوف مزید فرماتے ہیں کہ:

قاری صاحب ہمارے پرانے دبستان علم کی فیروز مندیوں کا نشان، ہمارے قدیم نظام تعلیم کی کامیابی اور ثمر آوری کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔

مولانا محمد اشرف کے اس دعوے کا ثبوت موصوف کی وہ متعدد تقاریر و خطابات ہیں جو جدید ترین اور ادق ترین مسائل پر علی گڑھ، دہلی اور دوسرے مقامات کی جامعات میں دیے گئے، جن میں سے ایک کا ذکر سائنس اور اسلام کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ پھر اس کا ثبوت آپ کی تصانیف کثیرہ ہیں، جن میں علم کی گہرائی، معلومات کی وسعت، نکتہ آفرینی اور ادبی چاشنی سب کچھ موجود ہے۔

اسلام اور مسیحی اقوام نامی آپ کی تصنیف کے متعلق مولانا محمد اشرف فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب پڑھی، اس کے نقوش آج تک دل و دماغ میں مرتسم ہیں۔ یہ پہلی کتاب تھی جس نے حضرت قاری

صاحب کی عظمت اور علما کی قدر دل پر ثبت کی ہے۔

دینی کتابوں کے متعلق ان کی مجموعی رائے یہ ہے: "ان کی تصانیف ان کے متکلمانہ، حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں علوم و فیوض کا بحر ذخار ہیں۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری از خود اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیم کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے اور شک و ریب کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔"

اسلام اور مسیحی اقوام کے علاوہ التشبہ فی الاسلام، فطری حکومت، اسلام اور فرقہ واریت مشاہیر امت، شرعی پردہ، داڑھی کی شرعی حیثیت، مسئلہ تقدیر، اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام، غیب، خاتم النبیین، اسلام اور مغربی تہذیب، اصول دعوت، اسلام — عالمی مذہب، کلمہ حقیقت، نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر، آفتاب نبوت، اجتہاد اور تقلید، حدیث رسول کا معیار قرآن، اسلام کا اخلاقی نظام۔ یہ تمام کتابیں ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان میں سے کتاب ہندوستان اور پاکستان میں بار بار طبع ہو چکی ہے اور مانگ ہے کہ ختم نہیں ہوتی — ان مستقل تصانیف کے علاوہ آپ کی متعدد معرکۃ الآرا تقاریر خوب صورتی سے مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں، میں سائنس اور اسلام کے علاوہ شان رسالت، فلسفۂ نماز اور فلسفۂ طہارت نیز وعظ یوسفی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

المختصر یہ کہ وہ اس شعر کا بجا طور پر مصداق تھے:

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی۔ شریعت و طریقت کی مجالس ہوں یا قدیم جدید کی محافل، وہ ہر جگہ میر مجلس ہوتے اور ان کے وقار، بے علمائے وقار اور عظمت کا لوگوں کو اعتراف کرنا پڑتا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ونور اللہ تعالیٰ مرقدہ۔

سلہ البیان پشاور، اگست ۱۹۸۳